ڈاکٹر شاکر علیمی

# مولانا رُومیؒ
## اور
# انسانِ کامل

انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قوائے جسمانی و ذہنی سے ترتیب دیا ہے، اس میں بے شمار تنظیمی اور تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، جن کے طفیل وہ ایک طرف اپنے اعمال و افعال مرتب کرتا ہے تو دوسری طرف انسان اور حیوان کی نفسیاتی طریق کو واضح کرتا ہے۔ اس کی تمام تر سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نفسی ساخت میں کوئی ایسی توانائی ضرور موجود ہے جو عقائد وخیالات، افکار و احساسات، سیاسی و اقتصادی نظام، عائلی و معاشرتی تنظیم، اجتماعی و عمرانی فلسفہ یا شخصی و انفرادی تشکیل غرض زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ یہ توانائی حیات انسانی کے مخفی تاروں کو چھیڑ کر زندگی کے ساز میں سوز کی رمق بھی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے سب سے پہلے اس قوت و توانائی کو روشناس کرایا اور فطرت کے نام سے اسے موسوم کیا :-

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (سورۂ روم)

اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فطرۃ اللہ کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں :-

"اللہ کی فطرت سے مراد وہ قوت ہے جو ایمان کی معرفت میں
اس میں بھر دی گئی ہے"

گویا یہی قوت و توانائی خالص انسانی کا ماخذ اور تسخیر کائنات کا پیش خیمہ ہے۔ فطرت کی گمنامی سے انسان کی نفسی ساخت نورانی بن جاتی ہے، زندگی مادہ کی پیداوار نہیں رہتی بلکہ اس کا سرچشمہ مادرائے مادہ قرار پاتا ہے اور مغربی مفکرین کے وہ تمام نظریات باطل ہوجاتے ہیں جن کی بدولت انسان نورانی الاصل ہونے کے بجائے حیوانی النسل قرار دیا گیا ہے (ڈارون)۔ یا فطرت کی لطافت جبلت کی کثافت سے بدل دی گئی (میگڈوگل)۔ اب مادیت و روحانیت کی آمیزش اور ایمان و وجدان کے ذریعے ہی انسان کو اس کے منصب عظمیٰ کے فرائض کا احساس دلایا جائے گا۔ جس کے تحت ربانی توانائی کی نیابت اور کائنات کی تسخیر کی تمام ذمہ داریاں روز اول ہی اس کے سپرد کردی گئی تھیں: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً درحقیقت انسان کا کام صحیفہ کائنات کی تفسیر بیان کرنا نہیں بلکہ موجودات کو تسخیر کرنا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزدان گیر

مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کے نزدیک انسان کا منتہائے کمال یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو فنا کرکے ہستی مطلق میں جذب کردے بلکہ شرف انسانیت یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر زیادہ سے زیادہ شان دلفریبی اور قوت انجذاب پیدا کرکے ذات مطلق کو اپنے میں جذب کرلے۔ تخلقوا باخلاق اللہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ مولانا کی تمام تر شاعری کا مطالعہ کرلیجیے تو یہ حقیقت بہت واضح انداز میں سامنے آئے گی کہ انھوں نے حیات انسانی کے تمام شعبوں میں انسان کے کردار کی تفسیر بیان کی ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے انسان کے ان تمام اعمال و افعال کا جائزہ پیش کیا ہے جس کے تحت وہ نورانی الاصل کہلانے کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے اور اسی لیے وہ ایسے انسان کے آرزومند ہیں جو ربانی توانائی کا حامل ہو، کائنات کے تمام حجابات کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور احساس خودی کے ساتھ ذات مطلق کو اپنے میں جذب کرنے کی سعی کرتا ہو۔ چنانچہ انھوں نے دیوجانس کلبی کے ایک واقعے کو نظم کیا ہے جو ایک روز دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گمشدہ شے کو نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کررہا تھا

اور وہ گمشدہ شے انسان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی ؎

وی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سُست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

گویا مولانا رومی نے ان اشعار کے ذریعہ انسان کامل کی آرزو کی ہے۔ قرآن حکیم نے فطرۃ اللہ کو جن معنی میں استعمال کیا ہے، مولانا اسی کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات ترتیب دیتے ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی میں لامتناہی ممکنات موجود ہیں اور کائنات فقط اس عالم مادی کا نام نہیں بلکہ مرکز خلاقی کے گرد لامتناہی عوالم پائے جاتے ہیں جو ہر لمحہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان عوالم پر اپنا تصرف و تسلط قائم کرنے اور ربانی توانائی کو حیوانی جبلتوں پر غالب لانے کے لیے معرفت ذات ضروری ہے، کیونکہ غایت حقیقت صرف ایک ہی ہے جو ساری کائنات پر محیط ہونے کے سبب سے ہماری ذات سے نزدیک تر ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ اور نہ صرف یہ، بلکہ ہماری ذات اس کی صفات سے متصف ہے۔ اب معرفت ذات حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے جو حکمت و مشیت الٰہی سے ہم آہنگی کے باعث انسان کو الوہیت سے بہت قریب کر دیتی ہے ؎

درگزر از نام و بنگر در صفات
تا صفات رہ نماید سوئے ذات

ذات شخص کی معرفت حقیقتاً ذوق نمو کا وہ فطری قانون ہے جو کائنات کی ہر شئے میں جاری و ساری ہے، حیات و کائنات میں ایک قانون کلی یہ ہے کہ عروج و ترقی کے لیے ہستی ادنیٰ کسی وجود برتر سے ہم کنار و ہم آہنگ ہو اور یہ ہم آہنگی باعتبار صفات کے ہے چنانچہ مولانا اسی قانون کو کئی مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً سیل کا دریا میں گر کر دریا بن جانا، دا

اور وہ گمشدہ شے انسان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی ؎

وی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

گویا مولانا رومی نے ان اشعار کے ذریعہ انسان کامل کی آرزو کی ہے۔ قرآن حکیم نے فطرۃ اللہ کو جن معنی میں استعمال کیا ہے، مولانا اسی کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات ترتیب دیتے ہیں ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی میں لامتناہی ممکنات موجود ہیں اور کائنات فقط اس عالم مادی کا نام نہیں بلکہ مرکز خلاقی کے گرد لامتناہی عوالم پائے جاتے ہیں جو ہر لمحہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان عوالم پر اپنا تصرف و تسلط قائم کرنے اور ربانی توانائی کو حیوانی جبلتوں پر غالب لانے کے لیے معرفت ذات ضروری ہے، کیونکہ غایت حقیقت صرف ایک ہی ہے جو ساری کائنات پر محیط ہونے کے سبب سے ہماری ذات سے نزدیک تر ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد اور نہ صرف یہ، بلکہ ہماری ذات اس کی صفات سے متصف ہے۔ اب معرفت ذات حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے جو حکمت و مشیت الٰہی سے ہم آہنگی کے باعث انسان کو الوہیت سے بہت قریب کر دیتی ہے ؎

درگذر از نام و بنگر در صفات
تا صفات رہ نماید سوئے ذات

ذات شخص کی معرفت حقیقتاً ذوق نمو کا وہ فطری قانون ہے جو کائنات کی ہر شئے میں جاری و ساری ہے، حیات و کائنات میں ایک قانون کلی یہ ہے کہ عروج و ترقی کے لیے ہستی ادنیٰ کسی وجود برتر سے ہم کنار و ہم آہنگ ہو اور یہ ہم آہنگی باعتبار صفات کے ہے چنانچہ مولانا اسی قانون کو کئی مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً سیل کا دریا میں گر کر دریا بن جانا، دانے

کا مٹی میں مل کر کھیت بن جانا، روٹی کا جسم میں پہنچ کر انسان کی جان اور شعور میں تبدیل ہوجانا۔ موم کو آگ سے پُرانوار ہوجانا یا سرمہ کا آنکھ میں پڑ کر بینائی بن جانا ؎

سیل چون آمد بدریا بحر گشت
دانہ چون آمد بمزرع کشت گشت

چون تعلق یافت نان با بوالبشر
نانِ مردہ زندہ گشت و باخبر

موم و ہیزم چون فدائے نار شد
ذاتِ ظلمانی او انوار شد

سنگ سرمہ چون کہ شد در دیدگان
گشت بینائی شد آنجا دیدہ بان

اے خنک آن مردہ کز خود رستہ شد
در وجودِ زندہ پیوستہ شد

محض اسی لیے انسان بھی عالم مادی کی تنگ دامانی کے سبب ماورائے مادہ رجوع کرتا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے اور اس طرح وہ ذات مطلق سے مربوط ہوجاتا ہے مفکرین اسلام میں عبدالکریم جیلی بھی یہی خیالات پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے۔ انسان ہستی ذات باری کی خارجی شکل ہے۔ بغیر انسانی وجود کے ذات مطلق اور کائنات فطرت میں ربط قائم نہیں ہوسکتا۔ انسان ان دونوں وحدتوں میں اتصالی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کامل تخلیق کائنات کا اصل مقصد ہے۔ ذاتِ انسانی کے توسط سے ذاتِ مطلق خود اپنا مشاہدہ کرتی ہے، اس لیے کہ سوائے اس کے کسی اور مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن سکے۔

مولانا رُومی فرماتے ہیں کہ انسان اگر خاک پر جنم لیتا ہے لیکن اس کی اصل فطرت روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن رہتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ انسان اپنے وجود کو مطلق فنا کرکے واصل حق ہوجائے، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کامل ہمیشہ اپنی انفرادیت کو پیش نظر رکھتا ہے

اس کے لیے وہ دریا اور مچھلی کی مثال دیتے ہیں جو اپنی زندگی کے لیے دریا کی محتاج ہے او اور اس کے اندر غرق رہتی ہے، باوجود اس کے اس کا اپنا وجود برقرار رہتا ہے۔ البتہ دونو میں کامل درجہ کا اتصال قائم ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کامل بھی فنا فی اللہ ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے لیکن وہ ذاتِ مطلق سے کامل توافق و ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ذاتِ حق سے متصل بھی ہے اور منفصل بھی ؂

متصل نے منفصل اے کمال — بلکہ بے چون و چگونہ اعتلال
ماہیانیم و تو دریائے حیات — زندہ ایم از لطفت اے نیکو صفات
تو نگنجی در کنارے فکرتے — نے بمعلولی قرین با علتے

مذکورہ تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ مولانا رومی کے نزدیک انسان کامل وہی ہے جو اپنی ذات کی معرفت حاصل کر کے حقیقت اقصلی سے ہم آہنگ ہو جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ معرفت نفس یا ذات کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں؟ اس کے لیے ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ فطرت خود اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلا کے واقعے میں اس بات کو بخوبی بیان کیا ہے اور علامہ اقبال اپنے ایک خطبے میں اس طرح اس کی وضاحت کرتے ہیں:

"انسان کی ارتقائی کوششوں میں خدا اس کا معاون ہوتا ہے بشرطیکہ ہمت اور انقلاب کی ابتدا انسان کی طرف سے ہو۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم یہی ہے کہ خدا انسانوں کی حالتوں کو نہیں بدلتا، جب تک وہ پہلے اپنے اندر انقلاب نہ پیدا نہ کر لے۔ اگر سعی و انقلاب و ارتقاء نہ ہو تو انسان کی حیثیت جمادات کی سی رہ جاتی ہے، تمام ترقی کا مدار اس پر ہے کہ انسان اپنے ماحول سے خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی از روئے علم صحیح رابطہ قائم کرے۔ حسی ادراک اور عقل جو محسوسات میں نظم تلاش کرتی ہے یا منظم کرتی ہے، علم کے مآخذ ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ آدم کو اشیاء کا علم عطا کیا گیا، اس کی بدولت اس کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی، جس کے معنی ہیں کہ

ناظم قوتیں علم اشیاء سے مطیع ہوتی اور انسان کے سامنے سربسجود ہوتی ہیں، قرآن تمام مظاہر فطرت کو آیاتِ الٰہی قرار دیتا ہے اسی علم سے عرفان بھی پیدا ہوتا ہے اور قوتِ تسخیر بھی حاصل ہوتی ہے۔ اہل بصیرت اور اہلِ علم کے لیے خارجی اور باطنی فطرت ہی حقیقت رسی کا ذریعہ ہے۔"[1]

ڈاکٹر اقبال کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات و کائنات کا ہر محسوس پہلو ایک علامت ہے اور جس حقیقت کی وہ علامت ہے وہ خود روح انسانی میں داخل ہے، آگے چل کر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"از روئے قرآن حقائق کا علم مختلف راستوں سے حاصل ہوتا ہے حسی ادراک اور تعقل اس کا ایک اہم راستہ ہوتا ہے، یہاں علم محسوسات اور معقولات کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ بالواسطہ ہے۔ اس کے علاوہ نفسِ انسانی پر حقیقتِ حیات براہِ راست بھی منکشف ہوتی ہے۔ قرآن میں مطالعۂ فطرت کا حوالہ اسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہے کہ انسان کا خارجی فطرت سے بھی ایک قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ اس راستے کا فہم انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں سے استفادہ کر سکے۔ مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا فی نفسہٖ مقصود نہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ انسان روحانی زندگی کے مقصد اشرف کے حصول میں ترقی کا قدم اٹھا سکے۔ قرآن ایک ہی آیت میں سمع و بصر کے ساتھ فؤاد یعنی دل کو بھی ذریعہ معرفت قرار دیتا ہے ..... مذہبی وجدان کے ذریعہ کشفِ حقیقت نوع انسانی کا ایک وسیع تجربہ ہے۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو عقل و تجربے کی رہنمائی عطا کی گئی اور حقائق اشیاء کا علم بھی

---

[1] و [2] ذکرِ اقبال از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

دیا گیا، جس کے ذریعہ وہ تمام محسوسات کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیتا ہے، لیکن ماورائے محسوسات بھی ایک عالم موجود ہے وہ عالمِ غیب ہے۔ عالم الغیب والشهادة، هو الرحمٰن الرحیم۔ عالم غیب کی اشیاء اگرچہ خلافِ عقل نہیں، ماورائے عقل ضرور ہیں عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ مولانا رومی جہاں عقل کے فضائل بیان کرتے ہیں وہاں وہ عقل کی نارسائی کے بھی مدعی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اعضاء و جوارح جس طرح ایک ذریعہ ہیں اسی طرح عقل بھی ایک معتبر آلہ ہے اس کے بغیر انسان اور گدھے میں تمیز مشکل ہے ؎

آدمی را عقل باید در بدن
ورنہ جان در کالبد دراد حمار

مثنوی میں جگہ جگہ عقل کی نارسائی کا ذکر ملتا ہے اور خصوصاً اس وقت جب کہ وہ اس کو عشق کے بالمقابل لاتے ہیں اور جہاں کہیں وہ عقل کے فضائل بیان کرتے ہیں تو اس سے مقصود عقل کلی ہوتی ہے عقل جزوی نہیں۔ وہ اس سلسلے میں قدیم فلاسفہ کے نظریات کے ہم نوا ہیں۔ مثلاً ارسطو نے عقل کو ماہیت وجود قرار دیا، وہی ان کے نزدیک اصلیت کی اساس ہے۔ اس کے یہاں خدا کا تصور بھی عقل کل کا تصور ہے۔ مولانا عقل کو حکمت و عرفان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکمت عشق کی منزل تک پہنچا دیتی ہے جو درحقیقت وحی و الہام کا مقام ہے، جس کے ذریعہ وہ خود لوح محفوظ بن جاتا ہے، جس پر ازلی حقائق ثبت ہیں ؎

منبع حکمت شود حکمت طلب    فارغ آید او ز تحصیل و سبب
لوحِ حافظ، لوح محفوظے شود    عقل او از رُوح محفوظے شود

لیکن عقلِ جزوی انکشاف حقیقت کے لیے غیر ضروری ہی نہیں بلکہ بہت سی وجوہ سے سدِراہ بھی ہے۔ مثلاً عقل کی پہلی مجبوری تجزیہ ہے۔ یہ کسی بھی حقیقت کو بغیر تجزیہ کے نہیں سمجھ سکتی اور اس طرح وہ وحدت کو کثرت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ذاتِ شخص کو عقل جسم و رُوح کے تضاد میں پیش کر کے وجود شخصی کو معدوم کر دیتی ہے یا اسی طرح انکار، اثبات اور تضاد میں اصل حقیقت کو محبوس کر دیتی ہے۔ وہ تعینات مکانی کی بھی پابند ہوتی ہے۔

عقل کی ان مجبوریوں کے پیشِ نظر ہمارے سامنے لاتعداد مثالیں ہیں۔ وحدت وکثرت، عرض د جوہر، علت دمعلول اور سبب ومسبب وغیرہ وغیرہ مثنوی میں عقل کی ان مجبوریوں سے متعلق بہت سے اشعار موجود ہیں۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں ؂

گر بہ استدلال کار دین بُدے     فخر رازی راز دارِ دین بدے
پائے استدلالیاں چوبین بود     پائے چوبین سخت بے تمکین بود
وانکہ او این نور را بینا بود     شرح او کے کار بوسینا بود

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ عقل کاشف حقیقت نہیں تو پھر وجدان ہی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس سے ذاتِ مشخص کا ادراک ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں برگساںؔ نے بڑی تحقیق اور نکتہ آفرینی کی ہے جس سے علامہ اقبالؔ بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور علمی سطح پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی حد تک مولانا رومیؔ اس کے پیش رو تھے۔ برگساں عقل استدلالی کو جو استخراج اور استقراء سے کام لیتی ہے، اس عالم مادی میں جسمانی افادیت کا حامل تو سمجھتا ہے لیکن حقیقت کے ادراک کے لیے اس کو عاجز و مجبور پاتا ہے اور وجدان کو ہی انکشافِ حقیقت کا بہت بڑا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ اس نے وجدان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ عالم کائنات میں عقل کی کارفرمائی مخصوص تصورات کے تحت ہوتی ہے۔ یہ تصورات کسی بھی شئے کے انھی اوصاف کو ظاہر کرسکتے ہیں جو تمام اشیاء کے درمیان مشترک ہوں۔ مثلاً شخصی زندگی میں مشترک خیالات، احساسات اور واردات وغیرہ لیکن وہ ان تمام ذاتی صفات کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہے جو کسی شے یا شخص سے متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثل بھی ہیں۔ اس کے خیال میں ذاتِ شخص کو اگر تعقل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ صرف موہوم نقطے کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گی، اس لیے وجدان کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے حقیقت ذات کا انکشاف ہوسکے۔ وحدت وکثرت کے وہ تمام حقائق جو ذات شخص سے متعلق ہیں اور درونِ سینہ مضمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ متغیر ومنقلب ہیں صرف اور صرف وجدان ہی کے ذریعے سمجھے جاسکتے ہیں۔ برگساںؔ نے وجدان کے ذریعہ تسلسل حیات میں زور زندگی کا پتہ بھی دیا ہے جس کو سمجھنے کے لیے برگساں کے نظریہ زمان ومکان کو سمجھنا

ضروری ہے۔

برگسان جس وجدان کا ذکر کرتا ہے مولانا رومی حقیقت تک رسائی کے لیے اس کو بھی معذور خیال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ برگسان تسلسل حیات میں نمود زندگی کو ہی اصل حقیقت کے مترادف سمجھتا ہے حالانکہ نمود زندگی خود ایک بلند تر حقیقت سے متعلق ہے۔ مولانا جب عقل و وجدان سے ہٹ کر قلبی رجحانات اور ذوق طلب کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ تمام اشارات و کنایات، استعارات و تشبیہات، تصورات و بیانات مقام ذات کی معرفت میں ناقص و نارسا ہیں، البتہ جذبہ عشق اس طرف رہنمائی کرتا ہے ؎

گرچہ تفسیر زبان روشن گر است — لیک عشق بے زبان روشن تر است
چون قلم اندر نوشتن می شتافت — چون بعشق آمد قلم بر خود شگافت
محرم این ہوش جز بے ہوش نیست — مر زبان را مشتری جز گوش نیست

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

دل را ز جان برکندہ ام یا چیزی دیگر زندہ ام
عقل و دل و اندیشہ را از بیخ و بن شوریدہ ام

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں :-

"تمام کائنات اس لیے مائل بہ ارتقاء ہے کہ وہ خدا کی طرف عود کرنا چاہتی ہے۔ اس تنزلاتی اور تدریجی نظام میں وہ جذبہ جو عالم کے اجزا میں اتحاد پیدا کرتا ہے۔ جذبہ عشق ہے، لیکن محض اتحاد اجزا اور نظم عالم غایت حیات و کائنات نہیں۔ ہر ذرے کا مقصود عروج و صعود الی اللہ ہے۔ مادہ سے خدا تک ایک نردبان ہے اور جس ہستی کو بھی خدا کی طرف جانا ہے اسے پا بہ پا، قدم بہ قدم ترقی ہے۔ مادۂ آب و خاک میں جب ایک بیج ڈال دیا جاتا ہے تو اس کے گرد و پیش کا تمام مادہ جو جامد و بے جان معلوم ہوتا تھا، نبات کی صحبت میں اپنی ہستی کو فنا کر کے نخل کی صورت میں مبدل ہو جاتا ہے ..... اس طریقے

سے عشق، اعلیٰ تر اقدار حیات کا خلاق بن جاتا ہے اور عشق کی بدولت
ہستی کا ہر ذرہ وسیع تر اتحاد پیدا کرنے اور اُوپر کی طرف ترقی کرنے
پر مائل ہے۔[1]

گویا عشق کے ذریعہ عقل سے بھی ماوراء جانے کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے
ہیں ؎

عقل گوید شش جہت حد است و ہیچ بیرون راہ نیست
عشق گوید ہست راہ رفتہ ام ... یار ہا
عاشقانِ خستہ دل را در درونست ذوق ہا
عاقلان تیرہ جان را در د...و... انکار ہا

مولانا نے ان اشعار کے ذریعہ حِسِ قلبی اور روحی تشنگی کی طرف توجہ دلائی ہے اور جس
کی بنا پر حقیقت اقصیٰ کی معرفت کا حصول ممکن ہے، اس کی تائید میں قرآن حکیم میں بکثرت
اشارات موجود ہیں۔ مثلاً وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ؎

در مدرسۂ آدم با حق چو شدی محرم
بر صدر فلک بنیش تدریس را اسماء کن

اس کے علاوہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔
(جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہوتی ہے)۔
ایمانی قوت محبت کی شدت سے پیدا ہوتی ہے اور عشق جو صداقت کا سرچشمہ ہے، انسان
کے افعال و اعمال میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے، حیات و کائنات میں حرکت و ارتقا عشق ہی
کے سبب سے ہے۔ قرآن حکیم میں خداوند قدوس کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان سب
میں رحمت و ربوبیت کی صفات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ رحمت کی صفت عین ذات ہے
جو خلاقی اور ربوبیت کی اساس ہے، اور اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ انسانِ کامل عشق کی ابدی حقیقت

---

[1] فکرِ اقبال۔ صفحہ ۳۳۹

سے عشق، اعلیٰ تر اقدار حیات کا خلاق بن جاتا ہے اور عشق کی بدولت ہستی کا ہر ذرہ وسیع تر اتحاد پیدا کرنے اور اُوپر کی طرف ترقی کرنے پر مائل ہے۔[1]

گویا عشق کے ذریعہ عقل سے بھی ماوراء جانے کا راستہ پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عقل گوید شش جہت حد است و بیرون راہ نیست
عشق گوید ہست راہ رفتہ ام من بارہا
عاشقان خستہ دل را در درونست ذوق ہا
عاقلان تیرہ جان را در درون انکار ہا

مولانا نے ان اشعار کے ذریعہ حس قلبی اور روحی تشنگی کی طرف توجہ دلائی ہے اور جس کی بناء پر حقیقت اقصیٰ کی معرفت کا حصول ممکن ہے، اس کی تائید میں قرآن حکیم میں بکثرت اشارات موجود ہیں۔ مثلاً وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ؎

در مدرسۂ آدم با حق چو شدی محرم
بر صدر فلک بنشیں تدریس را اسماء کن

اس کے علاوہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہوتی ہے)۔ ایمانی قوت محبت کی شدت سے پیدا ہوتی ہے اور عشق جو صداقت کا سرچشمہ ہے، انسان کے افعال و اعمال میں ہم آہنگی پیدا کردیتا ہے، حیات و کائنات میں حرکت وارتقا عشق ہی کے سبب سے ہے۔ قرآن حکیم میں خداوند قدوس کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان سب میں رحمت و ربوبیت کی صفات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ رحمت کی صفت عین ذات ہے جو خلاقی اور ربوبیت کی اساس ہے، اور اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ انسانِ کامل عشق کی ابدی حقیقت

---

[1] فکر اقبال۔ صفحہ ۳۳۹

سے واقف ہوتا ہے، اسی لیے وہ اخلاقِ حسنہ کا پیکر ہوتا ہے کیونکہ اخلاق حسن محبت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔

اللہُ جمیلٌ ویُحبُّ الجمال

مولانا کے نزدیک انسان کامل عشق کی ہمہ گیری کو محسوس کرکے اس کا پیکر بن جاتا ہے۔ کیونکہ عشق حیات بھی ہے اور مصدرِ وجود بھی، معرفتِ ذات بھی ہے اور مظاہرِ وجود بھی۔ فرماتے ہیں کہ عشق مصدرِ وجود ہونے کے سبب انسانی اعمال میں فطرتِ الٰہی کو جذب کردیتا ہے اور اس قانونِ تجاذب کا کائنات کا ذرہ ذرہ پابند ہے۔ کائنات میں اجسام و اجرام میں باہمی کشش بھی عشق ہی کی رہینِ منت ہے ؎

جملہ اجزائے جہان زان حکمِ پیش
جفت جفت و عاشقانِ جفتِ خویش

ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ
راست ہم چون کہربا و برگ کاہ

آسمان گوید زمین را مرحبا
با توام چو آہن و آہن ربا

ارتقائے حیاتِ انسانی میں عشق ہی صداقت کا سرچشمہ ہونے کے سبب بقائے حیات ہے سوزِ زندگی ہے۔ اسی کے دم سے درونِ سینہ کی ساری حقیقتیں انسان پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب رقمطراز ہیں:

"عارفِ رومی کے نزدیک عشق فقط انسان کا جوہر نہیں بلکہ حیات و کائنات کی قوت تخلیق اور ذوق ارتقاء عشق ہی کے رہینِ منت ہیں۔ زمانۂ حال میں اس نظریۂ حیات کے سب سے زیادہ بلیغ مبلغ علامہ اقبالؒ گزرے ہیں جو اس بارے میں اپنے مرشد رومی کے ہم پایہ ہیں۔ مولانا اس کو دلنشین کرنے کے لیے کبھی تشبیہات سے کام لیتے ہیں اور کبھی مظاہر کائنات کی طرف توجہ دلاتے ہیں ..... مولانا فرماتے ہیں

کہ مکانی وسعتیں محض مظاہر کی وسعتیں ہیں جن کی حقیقت بس ایسی ہے
جیسا کہ سمندر کے اوپر جھاگ۔ حقیقتِ حیات بحرِ بے پایاں عشق ہے۔
افلاک وجود اور ان کی گردشیں اسی کی بدولت ہیں اور بالقوہ اس
عشق کا سب سے بڑا مرکز و محل انسان کا دل ہے [۱]

بلاشبہ یہ قلبِ انسانی ہی ہے جو مادیت کے لیے غیر مادی ذرائع علم و ادراک کا ابتدائی مقام ہے جو تمام جواہر کی تدبیر کرتا ہے، جس میں لطف روحانی و باطنی قوت موجود ہے۔ اسی قوت و توانائی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فراست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے :

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ "

اور انسان کامل کی خصوصیت میں جس کو شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ انسان کامل میں قلب ہی ایک ایسی چیز ہے، جس میں عشق کی شور انگیز لہریں پیدا کردینے کے بعد حقیقت مطلق اپنی تمام تر صفات کو اس میں وحید و بے مثل کردیتی ہے اور پوری کائنات از خود اپنے تمام رازہائے سربستہ اس پر واشگاف کرنے لگتی ہے۔ مولانا رومی کے نزدیک انسان کے آئینہ قلب پر جب عشق کی حقیقتیں منعکس ہونے لگتی ہیں تو وہ کمال کی تمام حدوں کو چھونے کے قابل ہوجاتا ہے۔ پھر اس کو آب و خاک سے چنداں نسبت نہیں رہتی۔ اس کا کوئی عمل آئین الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا اور اشیاء کی حقیقت کا راز اس کی ذات پر منکشف ہونے لگتا ہے۔

انکشاف حقیقت یا معرفت، حکمت کے عرفان کا نام ہے، جو علم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ نعمت سب سے اول انسان کو ودیعت کی گئی تھی، جس کی بنا پر اسے ملائکہ پر تفوق حاصل ہوسکا۔ گویا انسان کامل کا جوہر علم ہوا اور چونکہ علم کی کوئی حد نہیں اس لیے معراج انسانیت کی بھی کوئی حد نہیں۔ علم صحیح فطرت اللہ کے قوانین سے آتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آدم خاکی ز حق آموخت علم
تا بہفتم آسمان افروخت علم

---

[۱] تشبیہاتِ رومی۔ صفحہ ۵۴۵

نام و ناموس ملک را در شکست
کور ہٗ آن کس کہ با حق در شک است
خاتم ملک سلیمان است علم
جملہ عالم صورت و جان است علم

انسان حواس سے کائنات کا ادراک کرتا ہے، لیکن یہ اس کافی نفسہ ذریعہ علم نہیں، نورِ دل یا بصیرت ذریعہ علم ہے، لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ؎

نور نورِ چشم خود نور دل است — نور چشم از نور دلہا حاصل است
باز نورِ نورِ دل نور خدا است — کو ز نور و عقل و حس پاک جدا است

کائنات کی ساری حقیقتیں قلب انسانی پر منعکس ہوتی ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوتی ہیں جب قلب صاف و مصفیٰ ہو اور قلب جب مصفیٰ ہوجاتا ہے تو وہ انسان کے مادی جسم اور مکانی حدود کا پابند نہیں رہتا، بلکہ اس کا مقام فراز عرش ہوتا ہے ؎

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست — دل فراز عرش باشد نے بہ پست
آئینہ دل چون شود صافی و پاک — نقش ہا بینی برون از آب و خاک
روزنِ دل گر گشاد است و صفا — می رسد بے واسطہ نورِ خدا

سوال یہ ہے کہ آئینہ دل جو عشق کا مرکز ہے، کس طرح مصفی کیا جائے، اس کے لیے مولانا فرماتے ہیں کہ تزکیۂ نفس سے دل کو صاف کیا جائے۔ دل جو جسم انسانی کا جوہر ہے۔ اخلاق میں پاکیزگی اور اعمال میں بے غرضی و بے لوثی ہی سے مصفا ہوسکتا ہے۔ تزکیہ نفس کے بعد صحیح علم حاصل ہوتا ہے، ہَوا وہَوس، طمع و حسد، بغض و عداوت، اغراض کی کج بینی اور اعمال و افعال کی کج روی دل کو زنگ آلود کردیتی ہے اور حقیقت اس پر منعکس نہیں ہوتی۔ علم تو نورِ الٰہی ہے جو تزکیۂ نفس کے بعد حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جو تزکیۂ نفس کے بعد حاصل ہوتا ہے، مبدل بہ حکمت ہوجاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکمت کو "خیر کثیر" کہا ہے وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔

مولانا فرماتے ہیں، صحیح علم تزکیہ نفس ہی سے حاصل ہوتا ہے، جو آبِ حیات ہے ؎